مولانا لطف اللہ پشاوری

نقوشِ زندگی

مولانا مرحوم کے ساتھ میری رفاقت ۱۹۲۷ء سے ہے جبکہ وہ افغانستان سے تشریف لائے اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا تھا۔ پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک پشاور میں ان کے ساتھ شب و روز رفاقت رہی اور پھر مرحوم نے ''مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن'' کی بنیاد رکھی تو میں ان کا پہلا رفیق تھا' جو سات برس تک ان کے پاس درس و تدریس میں مصروف رہا۔ ہم دونوں میں بے تکلف دوستی تھی۔ ایک دوسرے سے اپنے تمام احوال و سوانح بیان کیا کرتے تھے۔ اب جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے' مولانا کے حالات ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

نسب اور خاندان

آپ کا نسبی تعلق حضرت سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہے' جو امام ربانی، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے خلیفہ تھے' ان کی جائے پیدائش ''بنور'' تھی' جو ریاست پٹیالہ میں سرہند کے قریب ایک قصبہ ہے' اسی کی نسبت سے آپ کی اولاد ''بنوری'' کہلاتی ہے' آپ کے خاندان کے کچھ لوگ سکھوں کے غلبہ کے دور میں سرحد آ کر آباد ہوئے' سرحد کے افغان قبائل نے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ ان کی پذیرائی کی اور ان سے تعلقِ ارادت استوار کیا' ان حضرات نے سرحدی قبائل میں بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور بعض جاہلی مراسم کی بیخ کنی کے لئے بڑی جدوجہد کی' موجودہ ریاست دیر کے بانی الیاس اخوند بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، جنہیں دیر کے قبائل نے اپنا رئیس منتخب کر لیا تھا' بعد ازاں آپ کے خاندان کے کچھ لوگ کوہاٹ میں اور کچھ پشاور میں اقامت پذیر ہوئے۔

مولانا محمد یوسف صاحب کے پردادا امیر احمد شاہ بڑے ذی وجاہت بزرگ تھے' موصوف نے پشاور میں ایک محلّہ آباد کیا جو انہی کے نام پر ''گڑھی میر احمد شاہ'' کے نام سے معروف ہے' اس محلے میں صرف اسی

شخص کو سکونت کی اجازت تھی جو نماز کا پابند ہو' میر احمد شاہ کے صاحبزادے میر مزمل شاہ تھے، یہی میر مزمل شاہ مولانا سید زکریا کے والد اور مولانا محمد یوسف بنوری کے دادا ہیں۔

مولانا کے والد ماجد

سید زکریا بادشاہ، صاحبِ حال بزرگ تھے' ان کی پوری زندگی عجیب وغریب مدوجزر میں گزری' ان کی والدۂ ماجدہ محمد زئی کابل کے شاہی خاندان سے تھیں' نواب تورو محبت خان کی طرف سے رشکئی کے پاس کچھ زمین بطور انعام عطا کردہ تھی' سید زکریا نے سلوک وتصوف کی وادی میں قدم رکھا تو ان پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ تمام دنیاوی دولت سے دستکش ہو گئے' نواب تورو کی زمین انہیں واپس کر دی اور سوائے سکونتی مکان کے باقی تمام جائیداد فروخت کر ڈالی اور مرشد کی تلاش میں پہلے تو دہلی، اجمیر وغیرہ ہندوستان کی مشہور خانقاہوں میں حاضری دی' بالآخر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چلہ کشی کے لئے بغداد چلے گئے' یہ ترکی حکومت کا دور تھا' عراق میں سخت بدامنی پھیلی ہوئی تھی' آپ وہاں کچھ عرصہ رہ کر ہندوستان چلے آئے اور پھر چلہ کشی کے لئے ضلع ناسک کے قریب بمبئی کے جنگل کا رخ کیا' کچھ عرصہ بعد زندگی نے پلٹا کھایا، اپنے گھر (پشاور) لوٹ آئے اور شادی کر لی اور ٹھیکے داری کا پیشہ اختیار کر لیا' کچھ زمانہ ریاست بہاولپور میں ٹھیکہ داری کی، پھر کابل جا کر حکومتِ افغانستان کے بعض منصوبوں پر کام کرتے رہے' وہاں ایک حاذق طبیب بھی تھے اور کابل میں ان کی طبابت کا بھی بڑا چرچا تھا' بہت سے لوگ ان کے دستِ شفاء سے فیض یاب ہوئے' خاندانی وجاہت، طبی مہارت اور ان کے علم وفضل کی بناء پر کابل حکومت کے اعیان واکابر سے ان کے گہرے روابط تھے' اسی زمانہ میں امیر امان اللہ خان والیٔ کابل نے انہیں دو ہوائی جہازوں کے خرید لانے کا ٹھیکہ دیا جو کسی ہندوستانی مہاراجہ کے پاس تھے' موصوف نے غالباً ریاست پٹیالہ سے دو جہاز خرید کر کابل پہنچا دیئے' بدقسمتی سے ان پر سارا خرچ سید زکریا کا ہوا' حکومت کابل نے ایک پیسہ بھی پیشگی نہیں دیا تھا، مگر جب جہاز کابل پہنچے تو افغانستان میں انقلاب آچکا تھا۔ امیر امان اللہ بھاگ کر یورپ چلے گئے تھے' خود سید زکریا بھی بدامنی کی وجہ سے کابل سے پشاور چلے آئے اور زندگی کا کل اندوختہ اس طرح ضائع ہو گیا اور ان کی زندگی میں عسرت وتنگدستی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

ولادت اور پرورش

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق ان کی ولادت: ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ کو ہوئی' اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی والدۂ ماجدہ کا انتقال ہو گیا' مولانا کی ایک پھوپھی صاحبہ نے جن کا نام مریم تھا، آپ کی پرورش کی۔ یہ بی بی بڑی صاحبِ کرامات ولیہ تھیں' حضرت مریم علیہا السلام کی طرح ان کے پاس بے وقت کے میوے

آتے تھے' اس قدر مرتاض عابدہ وقانتہ تھیں کہ انہوں نے سورۂ یٰسین پڑھتے ہوئے وضو کی حالت میں چرخے پر سوت کاتا اور اس کا کپڑا بنوا کر اپنے کفن کے لئے رکھا تھا' بعد میں مولانا کے والد سید زکریا درویشی کے عالم میں کہیں چلے گئے اور گھر میں کچھ نہیں تھا تو اس عابدہ خاتون نے اس کپڑے سے مولانا کے لئے عید کا جوڑا بنوا دیا۔

طالب علمی

مولانا مرحوم چھوٹی عمر میں کابل چلے گئے تھے' جہاں خوگیانی قبیلہ میں امیر حبیب اللہ خان نے آپ کے والد کو اناروں کا ایک باغ عطیہ دیا تھا' کچھ عرصہ بعد آپ' اپنے ماموں مولانا فضل صمدانی کے ساتھ پشاور واپس تشریف لائے اور پڑھنا شروع کیا' مولانا اکثر خلوت میں مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ: میرے بچپن میں والد نے میری تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی' اس کا ان کو بہت افسوس تھا' چھوٹی عمر میں آپ نے پشاور میں کن کن اساتذہ سے پڑھا؟ اس کا تو مجھے علم نہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ آپ نے مولانا حافظ عبداللہ صاحب سکنہ لنڈی سے صَرف کی کتابیں پڑھیں' یہ حافظ صاحب بڑے اہل اللہ تھے' دشمنوں کے ہاتھوں بے گناہ شہید ہوئے۔

غالباً آپ نے کابل کے اہلِ علم سے بھی کتابیں پڑھی تھیں' کابل کے مولانا عبدالقدیر صاحب سے مُلّا جلال پڑھنا مجھے یاد ہے' اسی زمانے میں امیر امان اللہ خان کے ایک وزیر نے جو جدید عربی ادب اور مصری طرزِ انشاء سے شغف رکھتے تھے' مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت دیکھ کر انہیں کچھ جدید مصری ادباء کی کتابیں ہدیہ کی تھیں' غالباً انہیں کتابوں کے مطالعہ کا اثر تھا کہ کابل کے بعد آپ اچھی شستہ اور سلیس عربی لکھا کرتے تھے' جبکہ آپ نے مقامات بھی نہیں پڑھی تھی، میں اس زمانے میں لاہور سے مولوی فاضل کر چکا تھا اور پنجاب یونیورسٹی میں عربی تحریر کی مشق بھی کر چکا تھا' اس کے باوجود میں مولانا کے سامنے احساسِ کمتری محسوس کرتا تھا۔ بہرحال یہی ادبی ذوق ہم دونوں میں ابتدائی دوستی کا ذریعہ بنا۔

دارالعلوم دیوبند میں

ہم دونوں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے' دونوں چھتہ مسجد کے حجرے میں رہتے تھے' ہماری عمر تقریباً ایک تھی۔ لیکن مجھے ان کی عفت و پاکبازی، حلم وحیا اور متانت و وقار نے بہت متاثر کیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس عنوان شباب میں بھی ان سے کوئی حرکت متانت کے خلاف سرزد ہوئی ہو۔

مولانا مرحوم کو امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے اسی زمانہ میں انتہاء درجہ کی عقیدت پیدا ہو گئی تھی' دارالعلوم میں قیام پر کچھ عرصہ گزرا تو آپ نے عربی میں ایک طویل خط حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں لکھا' جس میں ان سے استدعا کی گئی کہ مجھے اپنا خادم بنالیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خط پڑھا،

لے کر رکھ لیا اور دوسرے وقت آنے کو کہا' مولانا مقررہ وقت پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلا سوال کیا کہ ادب کہاں پڑھا ہے؟ عرض کیا۔ ''کہیں نہیں۔'' فرمایا۔ ''بس آپ کو حاجت نہیں، اتنا کافی ہے۔''(۱)

یہ میرا دورے کا سال تھا اور مولانا بنوری کا مشکوٰۃ کا۔ چونکہ آپ کا تعلق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہو گیا تھا' اس لئے آپ ان کے پاس بیٹھ کر ان مسودات کی تخریج اور ان پر نظر ثانی فرمایا کرتے تھے۔

میں تو امتحان دے کر وطن پشاور آ گیا، ادھر دیو بند میں مشہور زمانہ اسٹرائک ہو گئی، جس میں مولانا محمد انور شاہ، مولانا شبیر احمد، مولانا بدر عالم اور مولانا سراج احمد وغیرہ کا مہتمم حضرات سے اختلاف ہوا اور فیصلہ ہوا کہ یہ حضرات دارالعلوم سے علیحدہ ہو کر کسی اور جگہ تشریف لے جائیں' پچانوے فیصد طلبہ بھی ان کے ساتھ تھے' اس لئے ایسی جگہ کی تلاش ہوئی جو ان مدرسین کے ساتھ ان سب طلباء کا بوجھ بھی برداشت کر سکے' بالآخر ڈابھیل کے سیٹھ گارڈین اور موسیٰ میاں وغیرہ نے مشورہ کر کے ڈابھیل میں نئے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رفقاء سمیت تشریف لانے کی درخواست کی' جو طلبہ ان کے ساتھ دارالعلوم ڈابھیل گئے' ان میں مولانا محمد یوسف بنوری بھی شامل تھے' وہیں آپ نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

پشاور میں قیام

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد آپ واپس اپنے وطن (پشاور) تشریف لے آئے' اس اثناء میں آپ کے والد ماجد حکومت کابل سے دوبارہ قرضہ کا مطالبہ کرنے کے لئے کابل چلے گئے' کیونکہ کابل میں نادر خان کی حکومت قائم ہو چکی تھی جو گزشتہ حکومت کے قرضہ جات ادا کرنے کی قانوناً ذمہ دار تھی' آپ کے والد ماجد اپنے قرضے کے مطالبے کے لئے کئی سال کابل میں ٹھہرے رہے اور مولانا یوسف کو خطوط میں یہی لکھتے رہے کہ قرضہ ملنے والا ہے اور یہ کہ تمام مالی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

مولانا کی شادی

مولانا کی زندگی کا یہ دور بڑی آزمائش اور ابتلاء کا تھا' پشاور میں گھر کے تمام اخراجات جاری تھے، مگر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور جب والد صاحب کو خط لکھتے تو جواب آتا کہ بس عنقریب میں آنے والا ہوں اور تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ آپ کے چچا کی لڑکی، جس کے ساتھ آپ کی نسبت ہو چکی تھی، اس کی اراضی بھی

(۱)...... درخواست کے جواب میں فرمایا تھا۔ ''میں آپ کو اپنے ساتھ ملحق کرلوں گا۔'' (مدیر)

سید زکریا نے فروخت کردی تھی، جب مولانا کے والد ماجد کی کابل سے واپسی میں غیر معین تاخیر ہوگئی تو مولانا عبدالحق نافع کے مشورے سے طے پایا کہ مولانا کا نکاح اب بہرصورت ہوجانا چاہئے۔ وہ عجیب وغریب رات مجھے نہیں بھولتی، جب مولانا کی بیٹھک میں مولانا کا نکاح پڑھایا، مولانا خود دولہا تھے اور خود ہی دوسری طرف سے وکیل تھے، خود ہی نکاح خواں تھے۔ میں اور مولانا عبدالحق نافع گواہ تھے، شادی کے لئے اور اہتمام تو کیا ہوتا، کوئی جوڑا بھی نہیں بنایا گیا، نہ دولہا کے لئے نہ دلہن کے لئے، بس بدن کے پہنے ہوئے کپڑے ہی جامۂ عروسی تھا، گھر میں دو سیر چاول تھے، وہ پکائے گئے، یہ مولانا کا ولیمہ تھا۔ گھر میں ایک چارپائی سالم تھی اور ایک ٹوٹی ہوئی، سوائے ہم دونوں کے کسی کو شادی کا پتہ بھی نہ چلا۔ یہ تھا مولانا محمد یوسف بنوری کی شادی کا نقشہ جن کی رحلت پر پورے عالم اسلام نے ماتم کیا۔

قیام پشاور کے زمانہ کے کچھ اور مشاغل

یہ زمانہ صوبہ سرحد میں سیاسی کشمکش کا تھا، باوجودیکہ صوبہ سرحد کی عام آبادی ٹھیٹھ مذہبی ہے اور جو کچھ کرتی تھی، اسلام کے نام پر کرتی تھی، مگر گاندھی جی نے لیڈرانِ کرام کو سیکولرازم کا سبق پڑھا دیا تھا، شاید ان لیڈروں کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ ہمیں کیا پڑھایا جارہا ہے، لیکن کانگریسی ہندو اور پارسی عورتوں کی آمدورفت سے نوجوانوں میں بے دینی پھیل رہی تھی، یہاں ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندوستان میں جمعیت علماء، آزادئ وطن کے لئے کانگریس سے تعاون کررہی تھی اور صوبہ سرحد میں سرکاری ٹوڈی طبقے کی خواہش تھی کہ یہاں علماء کو اس سرخ پوش جماعت کے ساتھ لڑوا دیا جائے، اس طرح انگریزوں کی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی تقویت کی جائے۔ ہمارے لئے مشکل یہ تھی کہ اگر سرخ پوشوں کی مخالفت کرتے ہیں تو اس ٹوڈی طبقے کی خواہش برآتی ہے اور اگر خاموش رہتے ہیں تو گاندھی جی کا سیکولرازم چپکے چپکے اپنا کام کررہا ہے۔

نوشہرہ، مردان اور چارسدہ وغیرہ سے آکر بہت سے لوگ شکایت کرتے تھے کہ سرخ پوش علماء کی توہین کرتے ہیں، اس زمانے میں ایک کانگریسی ہندو بھگت سنگھ نامی کو لاہور میں پھانسی دے دی گئی، اس پر پشاور میں سرخ پوشوں نے ایک بڑا مظاہرہ کیا، جس میں ایک شاعر نے پشتو میں ایک ماتمی قصیدہ پڑھا، جس کا مقطع یہ تھا:

سردار دِہ شہیداں شُہ سردار بگت سنگھ

جس کا مطلب یہ تھا کہ سردار بھگت سنگھ سید الشہداء ہوگئے۔ سرخ پوشوں کے اس بے احتیاط رویئے پر علماء کو سخت رنجیدگی ہوئی، ان حالات کے پیشِ نظر ضروری ہوا کہ صوبہ سرحد کے اہلِ علم کو منظم کیا جائے اور انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے، چنانچہ جمعیت علماء سرحد کے نام سے ایک جماعت کی داغ بیل ڈالی گئی۔

جس کے کرتا دھرتا مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تھے' نوشہرہ میں علمائے سرحد کا ایک بہت بڑا اجتماع بلایا گیا' جس میں پورے صوبہ سرحد کے علماء جمع ہوئے' اس اجتماع میں مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عربی کا مشہور قصیدہ پڑھا جو اسی موقع کے لئے بنایا گیا تھا' اس میں علماء کو ترغیب دی گئی کہ جو کچھ قربانی کرو' ''جمعیت علماء'' کے جھنڈے تلے کرو، منظّم ہو کر فتنوں کا مقابلہ کرو' یہ اجتماع بہت کامیاب رہا' مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدے نے علماء میں جذبۂ جہاد کی روح پھونک دی' چنانچہ ایک منظّم جماعت بنائی گئی جس میں صوبہ سرحد کے علماء شامل ہوئے' خان عبدالغفار خان کو اس کارروائی کی اطلاع ہوئی تو سخت برہم ہوئے' ان کا خیال تھا کہ یہ جماعت میری مخالفت کے لئے بنائی گئی ہے' مگر یہ موصوف کی غلط فہمی تھی' بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ صوبہ سرحد میں علماء کرام کی سرگرمیوں سے خان عبدالغفار کو نقصان نہیں کچھ فائدہ ہی پہنچا' بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خان صاحب کے مخالفین کا مقابلہ اسی جمعیت نے کیا۔

انہی دنوں جمعیت علمائے سرحد نے ایک وفد صوبہ سرحد کے گورنر کے پاس بھیجا' جس میں مولانا بنوری اور راقم الحروف شامل تھے' گورنر سرحد ایک بڑا عقل مند انگریز تھا' اس وفد نے گورنر کے سامنے وہ سارے مظالم بیان کئے جو سرحد کی پولیس اور باڈر پولیس سرخ پوشوں پر ڈھا رہی تھی' گورنر نے شکایات سن کر وعدہ کیا کہ میں اس کا تدارک کروں گا' لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود سرحد کے سرخ پوش یہ سمجھتے تھے کہ صوبہ سرحد میں ان کے سوا اور کوئی جماعت نہیں ہونی چاہئے' اس لئے جمعیت علمائے صوبہ سرحد سے ان کی کشمکش جاری رہتی تھی اور حکومت بھی اس کشمکش سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی' چنانچہ مولانا بنوری نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی اور جمعیت علمائے سرحد کو یتیم چھوڑ دیا۔

کراچی کے مدرسے میں جب میں ان کا رفیق تھا تو مولانا اکثر مجھ سے بطور شکایت فرمایا کرتے تھے کہ تم مجھے سیاست کی گندی گلی میں گھسیٹ کر لے گئے تھے' مگر دیکھو! میں تم کو علم کے بازار میں گھسیٹ کر لایا ہوں۔

مولانا کا قادیانیوں سے ایک معرکہ

جمعیت علمائے سرحد سے تعلق کے زمانے میں ہمیں محسوس ہوا کہ پشاور میں قادیانی اپنے پاؤں پھیلا رہے ہیں اور دین سے ناواقف طبقہ کو گمراہ کر رہے ہیں' پشاور کا ایک قادیانی مسمّٰی غلام حسین' جو قرآن کریم کی قادیانی تفسیر (یا بلفظ صحیح تحریف) بھی لکھ چکا تھا' وہ پشاور میں صبح کو درسِ قرآن دیتا تھا' نوجوان وکلاء اور کالجوں کے ناپختہ ذہن طالب علم اس میں شریک ہوا کرتے تھے' پشاور کے مشہور لیڈر جو بعد میں مسلم لیگ اور پاکستان کا بڑا رہنما بنا (سردار عبدالرب نشتر) وہ بھی ان کے درس میں شریک ہوتا تھا' پشاور کے اسلامیہ کالج کا وائس پرنسپل

تیمور، مرزا بشیر الدین قادیانی کا رشتہ دار تھا۔ صاحبزادہ عبدالقیوم بانی اسلامیہ کالج کا چچازاد بھائی عبداللطیف قادیانی، صوبہ سرحد کی قادیانی جماعت کا امیر تھا، قادیانی سال میں ایک دفعہ ’’یوم النبی ‘‘ کے نام سے ایک بڑا جلسہ کرتے تھے، جس میں شرکت کے لئے تمام سرکاری افسروں کو دعوت نامے بھیجے جاتے، اس طرح کھلے بندوں قادیانیت کی تبلیغ کے لئے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

جب ہم جمعیت العلماء کے کام میں منہمک تھے تو میں نے دیکھا کہ قصہ خوانی بازار میں قادیانیوں کے اس جلسے کے اشتہارات لگ رہے ہیں، جن میں اسلامیہ کلب میں ’’یوم النبی ‘‘ کا اعلان تھا۔ میں نے مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کیا کہ قادیانیوں کی اس کھلی جارحیت کا سدّ باب ہونا چاہئے، میں ان دنوں اسلامیہ اسکول میں عربی کا معلم اور استاذ تھا، میں نے اسکول کی نویں اور دسویں جماعت کے طلبہ کو قادیانیت کی حقیقت بتائی اور قادیانیوں کے یوم النبی کے نام پر لوگوں کو بہکانے کی مکاری عیاں کی اور انہیں بھی اس معرکہ میں حصہ لینے کے لئے تیار کیا، جس کا نقشہ میں اور مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ بنا چکے تھے۔

مقررہ تاریخ پر قادیانیوں نے اسلامیہ کلب میں قالین بچھائے، اسٹیج لگایا اور جلسہ کا انتظام کرنے لگے۔ ہم دونوں بھی وہاں پہنچ گئے اور جا کر اعلان کر دیا کہ یہاں اہلِ اسلام کا جلسہ ہوگا، ہماری اور قادیانیوں کی کشمکش ہوئی، جس میں قاضی یوسف نامی قادیانی نے مجھ پر لاٹھی سے حملہ کر دیا۔

ہمارے رفقاء نے اس کو پکڑ کر نیچے گرا دیا، جو قادیانی کرسیوں پر براجمان تھے، انہیں بھی فرش پر گرا دیا۔ قادیانی ذلت و نامرادی کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے، اب اسٹیج پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، مولانا بنوری نے بڑی فصیح و بلیغ اور طویل تقریر فرمائی۔ مسلمانوں اور قادیانیوں کی کشمکش سن کر پورا شہر امنڈ آیا اور خوب جلسہ ہوا۔ قادیانیوں کو ایسی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا کہ جب سے اب تک انہیں پشاور میں ایسا ڈھونگ رچانے کی دوبارہ جرأت نہیں ہوئی۔

خدا طلبی کا جذبہ

کچھ عرصہ بعد مولانا خدا طلبی کے جذبے سے کچھ ایسے سرشار ہوئے کہ آپ نے سیاست وغیرہ کے سارے مشاغل کو خیرباد کہہ کر ایک افغانی بزرگ ’’شیر آغا‘‘ کے پاس طریقہ نقشبندیہ کی مشقیں شروع کر دیں۔ ’’شیر آغا‘‘ کابل کے باشندے تھے اور نقشبندی سلسلے کے شیخ تھے، افغانستان کی حکومت سے ناراض ہو کر پشاور آ گئے تھے اور پشاور میں متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے، انہوں نے مولانا کو مراقبہ وغیرہ کی تلقین کی، مراقبہ کے لئے مولانا پشاور کے پاس عبدالغفور صاحب کی قبر پر جاتے اور سارا دن مراقبے میں گزار دیتے، ان دنوں میں میرا آنا

جانا بھی مولانا کے پاس بہت کم ہو گیا تھا' کیونکہ انہیں تنہائی پسند تھی اور کسی کے آنے جانے سے ناگواری ہوتی تھی' ایک عرصے کے بعد مولانا نے مجھے بتایا کہ نقشبندی سلسلے میں قلب اور نفس کے لطیفے تو جلدی جاری ہو جاتے ہیں' لیکن میرے ساتوں لطیفے جاری ہو گئے تھے' ان دنوں مولانا پر عجیب وجد کی حالت طاری رہتی تھی۔ اور ان کے ہر بُن مو سے انہیں ذکر کی آواز سنائی دیتی تھی۔

ڈابھیل میں قیام

اوپر بتا چکا ہوں کہ مولانا کے والد ماجد ان دنوں کابل میں تھے اور ان کی واپسی میں تعویق ہو رہی تھی' ادھر حضرت مولانا کو ڈابھیل کی مجلسِ علمی کی جانب سے پیشکش ہوئی' چنانچہ آپ نے والد صاحب کی واپسی سے مایوس ہو کر ڈابھیل میں مجلسِ علمی کی ملازمت اختیار کر لی' اس میں جو کام آپ کے سپرد کیا گیا وہ بے حد کٹھن تھا۔ یعنی ''عرف شذی'' کے حوالوں کی تخریج اور انہیں مکمل طور پر نقل کرنا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ: حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک حوالے کے لئے بسا اوقات مجھے سینکڑوں صفحات کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا اور ان کی دو مثالیں پیش فرماتے تھے۔

۱..... حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کسی موقعہ پر متعارض روایات کی تطبیق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''یہ اس قبیل سے ہے کہ ''ہر راوی نے وہ بات ذکر کر دی جو دوسرے نے ذکر نہیں کی۔'' اس کے بعد فرمایا کہ ''یہ بڑا اہم قاعدہ ہے' مگر افسوس کہ مصطلح الحدیث کے مدونین نے اسے ذکر نہیں کیا' البتہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں کئی جگہ اس قاعدہ سے تعرض کیا ہے''۔

مولانا فرماتے تھے کہ: میں نے ان مقامات کو تلاش کرنے کے لئے پوری فتح الباری کا مطالعہ کیا' تب معلوم ہوا کہ حافظ نے پوری کتاب میں دس سے زیادہ جگہوں پر اس قاعدہ سے تعرض کیا ہے۔

۲..... حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اختلافِ صحابہ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ابوزید دبوسی نے بالکل صحیح فرمایا کہ: ''جب کسی مسئلہ میں صحابہ کا اختلاف ہو تو وہاں منشائے اختلاف کا معلوم کرنا اور اس نزاع کا فیصلہ چکانا بڑا دشوار ہے۔''

مولانا فرماتے تھے کہ: اس حوالے کی تلاش کے لئے میں دبوسی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تاسیس النظر'' پوری پڑھی' مگر یہ حوالہ وہاں نہیں ملا' خیال آیا کہ یہ حوالہ دبوسی کی دو کتابوں ''اسرار الخلاف'' یا ''تقویم الادلہ'' میں ہوگا..... مگر وہ دونوں غیر مطبوعہ تھیں اور میرے پاس موجود نہیں تھیں' پھر خیال آیا کہ یہ حوالہ بالواسطہ ہوگا یا تو شیخ عبدالعزیز بخاری کی کتاب ''کشف الاسرار'' کے حوالے سے ہوگا یا ابن امیر حاج

کی ''شرح التحریر'' کے واسطے سے۔ چنانچہ ان دونوں کتابوں کا بہت سا حصہ مطالعہ کرنے کے بعد دونوں میں یہ حوالہ مل گیا۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا کو اس تخریج میں کتابوں کی کس قدر ورق گردانی کرنا پڑی اور اس کے لئے اپنی کتنی صلاحیتیں وقف کرنا پڑیں' اس طرح ''عرف شذی'' کی تخریج وتحقیق میں ''معارف السنن'' کا مصالحہ تیار ہوگیا اور اسی تخریج کو آپ نے جدید طرز پر مدون کرکے ''معارف السنن'' تالیف فرمائی۔

مولانا کا سفرِ مصر

اس کے بعد مجلسِ علمی نے آپ کو ''فیض الباری'' اور ''نصب الرایہ زیلعی'' کی طباعت کے لئے مصر بھیجا' آپ کے ساتھ دوسرے رفیقِ کار مولوی احمد رضا بجنوری تھے' یہ مولانا مرحوم کا پہلا غیر ملکی سفر تھا' اس زمانہ میں مصر (اپنے خاص تجدد پسندانہ ذہن اور اخلاقی گراوٹوں کے باوجود) عالمِ اسلام کا علمی مرکز تھا اور جامعہ ازہر کی وجہ سے علوم وفنون میں عالمِ اسلام کا قلب شمار ہوتا تھا' وہاں پہنچ کر آپ نے مصر کے علماء سے برصغیر کے علماء کا تعارف کرایا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عامۃ المسلمین کا ایک دوسرے سے جو روحانی لگاؤ ہے' اس کی وجہ سے عالمِ اسلام کے مختلف ممالک کے باشندے گویا ایک ہی برادری کے فرد ہیں' مگر افسوس کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کے حقیقی حالات ومسائل سے اکثر وبیشتر ناواقف ہیں، دوسو سال کے مغربی وطاغوتی تسلط نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر کر رکھا ہے' کیونکہ خبر رسانی کے ذرائع یا تو خبر رساں ایجنسیاں، اخباری رپورٹر اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ ہیں، جن پر یہود ونصاریٰ اور کیمونسٹوں کا تسلط ہے اور وہ غلط خبریں اڑا کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف گمراہ کرتے رہتے ہیں یا پھر موجودہ زمانے میں ثقافتی تبادلوں کو (جو نچنیوں، گویوں اور اخلاق باختہ ایکٹرسوں کے ذریعے ہوتے ہیں) مختلف ممالک کے درمیان روابط کا مؤثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے' جن سے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حقیقی مسائل وحالات سمجھنے کا موقع تو نہیں ملتا' البتہ بے خدا تہذیب کے جراثیم ایک ملک سے دوسرے ملک کو ضرور منتقل ہوجاتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر مختلف ملکوں کے علمائے امت آپس میں روابط پیدا کریں، ایک دوسرے سے پورے طور پر متعارف ہوں تو اس سے نہ صرف عالمِ اسلام کے حقیقی مسائل سامنے آسکتے ہیں اور انہیں حل کرنے کی تدابیر ہوسکتی ہیں' بلکہ یہی چیز اسلامی اتحاد کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔

مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے علمائے ازہر اور دیگر علمائے مصر کو مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ،

مولانا محمد انور شاہ کشمیری اور مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ اکابر دیوبند کے علمی مقام سے متعارف کرایا اور ان کی گرانقدر تصنیفات اور ان کی علمی و دینی اور ملی و سیاسی خدمات سے آگاہ کیا' اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ہندوستان کے مفتی اعظم' مولانا کفایت اللہ صاحب فلسطین کانفرنس کے سلسلے میں مصر تشریف لے گئے تو ازہر اور مصر کے اکابر علماء اور اعیان مشائخ ان کے استقبال کے لئے جہاز کے عرشہ پر پہنچے اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ انہیں قاہرہ لائے۔ قاہرہ میں مفتی ہند کا شاندار استقبال ہوا' حضرت مفتی اعظم' مولانا کفایت اللہ چونکہ خود علیل تھے' اس لئے انہوں نے مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا نائب بنایا' جن لوگوں کو مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا تعارف ہے' انہیں معلوم ہوگا کہ حضرت مفتی صاحب عربی کے کتنے بڑے ادیب تھے' راقم الحروف کو چونکہ حضرت مفتی صاحب سے تلمذ کا شرف حاصل ہے' اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کا مولانا بنوری کو اپنا سیکریٹری بنا کر اپنی طرف سے ایڈریس کا جواب دینے کے لئے متعین کرنا' مولانا بنوری کی علمی و ادبی قابلیت کی وقیع سند ہے۔

مصر میں مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا بڑا علمی کارنامہ' مولانا محمد زاہد الکوثری کو اپنی علمی قابلیت سے متاثر کرنا ہے' اس موقعہ پر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مولانا کوثری مرحوم کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے:

مولانا کوثری مرحوم سلطنت عثمانیہ کے آخری اسلامی دور میں نائب شیخ الاسلام تھے' اس کے بعد مصطفیٰ کمال کا دور شروع ہوا' جس نے اسلامی ثقافت کا خاتمہ کر دیا اور آپ کے لئے اور شیخ الاسلام کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی' مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے دونوں کو پھانسی کے تختہ سے زندہ اتار لیا اور مصطفیٰ کمال نے دونوں کو رعایت دے کر ترکی سے جلاوطن کر دیا' چنانچہ شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری بیت المقدس چلے گئے اور مولانا کوثری قاہرہ میں پناہ گزین ہوگئے۔

مولانا کوثری مرحوم اور مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں قرآن و حدیث اور فقہ میں ''اعلم اهل الارض'' تھے' اور مولانا کوثری علمِ تاریخ اور علومِ جدیدہ میں مولانا محمد انور شاہ مرحوم سے آگے تھے' مرحوم داغستان قفقاز کے اصل باشندے تھے' وہاں سے زارِ روس کے مظالم سے جان بچا کر ترکی آگئے تھے اور یہاں سے لادین ترکی کے تختہ مشق بنے' آپ کی قابلیت کا اندازہ آپ کے مضامین سے کیا جاسکتا ہے جو ''مقالات کوثری'' کے نام سے طبع ہوئے ہیں' موصوف نے متعدد کتابیں ائمہ احناف، امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ پر لکھی ہیں' ایک کتاب اس اہم مسئلہ پر لکھی ہے کہ اگر ۳ طلاقیں ایک ہی وقت میں دی جائیں تو اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے' حلالہ شرعیہ کے بغیر وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوتی' اس مسئلہ میں انہوں نے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفرد پر

سخت تنقید کی ہے۔ نیز ایک بحث میں انہوں نے حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدۂ نونیہ پر تنقید کی ہے اور حنابلہ کے عقیدہ تجسم کو رد کیا ہے' الغرض شیخ کوثری بہت بڑے علامہ تھے' مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ کوثری سے حدیث کی سند لی اور انہیں اپنے اکابر سے متعارف کرایا۔ چنانچہ شیخ کوثری نے حضرت تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں اجازتِ حدیث طلب کرنے کے لئے خط لکھا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اجازت عطا کی۔ یہ علمائے ہند اور علمائے ترکی کے درمیان نقطۂ اتصال تھا جو بہت بڑی اسلامی خدمت ہے۔

علامہ کوثری کے علاوہ مصر میں مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات علامہ طنطاوی سے بھی ہوئی' انہوں نے اپنی تفسیر میں مختلف کواکب، مختلف سمندروں کے موجودات اور نباتات وحیوانات سے متعلق علومِ جدیدہ کو بھر دیا تھا' ان کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن میں کسی جگہ آسمان کا ذکر آیا تو آپ نے ستاروں کے بارے میں جدید مغربی مصنفین کی تحقیقات ذکر کرنا شروع کردیں' کسی جگہ مچھلی کا ذکر آیا تو جدید مغربی ذرائع سے مچھلیوں کی جو اقسام دریافت ہوئی ہیں' ان کا تذکرہ شروع کردیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ دورِ جدید کے تمام اکتشافات قرآن سے مستنبط ہیں' کم علم لوگ ان کے اس کارنامے سے بہت مرعوب ہیں' حالانکہ یہ معلومات یورپ کے محققین کے اکتشافات ہیں، قرآن کے علوم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ مولانا بنوری نے علامہ طنطاوی سے فرمایا کہ: آپ صرف ایک بات پر غور فرمائیں اور وہ یہ کہ علومِ قرآن کا مخزن صاحب وحی ﷺ ہیں، اور آپ کے بعد وہ حضرات ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے قرآنِ کریم کا علم حاصل کیا تھا' کیا یہ معلومات' جو قرآن کی تفسیر میں آپ نے درج کی ہیں' کبھی صحابہ کرامؓ کے ذہن میں ان کا تصور آیا؟ اگر جواب نفی میں ہے تو ان علومِ جدیدہ کو قرآن کریم کے کسی لفظ کی تشریح بنا کر تفسیر قرآن قرار دینا کس طرح صحیح ہے؟ قرآن کریم کا موضوع تو ہدایت ہے یعنی حق تعالیٰ کی مرضیات کی جانب بندوں کی راہنمائی کرنا۔ ان علومِ جدیدہ کا قرآن کریم اور مقصدِ نبوت سے کیا تعلق؟ علامہ طنطاوی نے ذرا غور کرنے کے بعد فرمایا کہ: آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں' گویا آپ فرشتے ہیں' جسے اللہ تعالیٰ نے میری اصلاح کے لئے بھیجا۔

اس واقعہ سے ایک طرف طنطاوی کی بلند پایہ حق پسندی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا (خصوصاً ایک ایسے شخص کے لئے جس کے قلم سے دنیا مرعوب ہو) بڑا ہی مشکل کام ہے اور دوسری طرف مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی عبقریت بھی اس سے ثابت ہوتی ہے کہ نوعمر عجمی ہونے کے باوجود اتنے بڑے آدمی کو قائل کرلیا۔

مولانا بنوری کا مصر کا سفر ''نصب الرایہ للزیلعی'' کی طباعت کی غرض سے تھا' حافظ زیلعیؒ نے اس کتاب میں ہدایہ کی احادیث کی تخریج کی ہے' یہ کتاب مذہبِ حنفی کی تائید میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی بڑی تمنا تھی کہ یہ مجموعہ احادیث طبع ہو جائے' مولانا بنوری نے اس کی طباعت کے لئے میاں برادران کو ترغیب دی' تاکہ استاذ محترم کی تمنا پوری ہو جائے۔

حضرت کشمیری کی تقریر ترمذی' جو دیوبند میں سنن ترمذی پڑھاتے وقت طلبہ کے سامنے کرتے تھے' وہ تو مولانا محمد چراغ صاحب نے دیوبند میں جمع کر کے شائع کر دی تھی' لیکن حضرت کشمیری کی صحیح بخاری کی تقریر زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھی' مولانا سید بدر عالم نے جو تقریر بخاری پڑھتے وقت قلم بند کی تھی، اسے بڑی محنت سے مرتب کیا اور مولانا بنوری نے وہ بھی ''فیض الباری'' کے نام سے مصر میں چھپوائی' دونوں کتابوں کی طباعت ایسے عمدہ کاغذ اور دیدہ زیب ٹائپ پر کروائی کہ ہندوستان کے لوگ اس زمانہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے' ان کی طباعت پر مولانا نے بڑی محنت کی' ان پر مقدمے لکھے، نصب الرایہ کا مقدمہ شیخ کوثری سے بھی لکھوایا' ان کتابوں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے سے مولانا بنوری کی نہ صرف غیر معمولی قابلیت کا' بلکہ نفاست پسندی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

مولانا بنوری جامعہ ازہر کے ایک بڑے عالم کے علمی تبحر کی بہت تعریف فرماتے تھے، جو مادرزاد نابینا تھے' ان کا نام نامی یوسف دجوی تھا' مولانا بنوری نے عنایت اللہ مشرقی کی کتاب ''تذکرہ'' ان کے سامنے پیش کی، جس پر انہوں نے مشرقی کے کفر کا فتویٰ صادر فرمایا۔ ان دنوں ہندوستان میں عنایت اللہ مشرقی کا شہرہ تھا' اس فتوے سے ملک میں بڑا ہنگامہ اٹھا تھا' اس کا تذکرہ آگے چل کر بھی کروں گا۔

مصر میں مولانا نے بڑے بڑے علمی کتب خانوں کو کھنگالا اور مصر میں اپنے کام سے فارغ ہو کر آپ استنبول (ترکی) تشریف لے گئے' اگرچہ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے علم دین کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن وہاں کے کتب خانے تمام دنیا میں اسلامی علوم کے بڑے خزانے تھے' عثمانی دور میں ترکی کی ہر مسجد کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی ہوتا تھا' جو اس دورِ الحاد میں عثمانی حکومت کی علم پروری کا مرقع تھا' آپ نے ترکی کے کتب خانوں کی بھی سیر کی' لیکن افسوس کہ کسی قابل ذکر عالم کا ذکر نہیں کرتے تھے' کمالی خزاں نے اسلامی باغ کے تمام درختوں کو بے برگ و بار کر دیا تھا۔

اسی سفر میں آپ حرمین شریفین بھی حاضر ہوئے اور حضرت سید المرسلین ﷺ کے روضہ اطہر کی زیارت سے مشرف ہوئے' یہ ۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا۔ اسی دوران آپ نے سلطان عبدالعزیز مرحوم سے بھی مکہ معظمہ میں ملاقات کی اور انہوں نے ''فیض الباری'' کے دو سو نسخے خرید کر حجاز اور نجد کے کتب خانوں میں تقسیم فرمائے۔

ڈابھیل میں صدارتِ تدریس

طبع شدہ کتابوں کا ذخیرہ ساتھ لے کر آپ واپس ڈابھیل آئے تو ڈابھیل میں حضرت مولانا انور شاہ

کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دونوں بزرگوں کی مسندِ حدیث کے وارث ہوئے' آپ کی علمی شہرت اس زمانے میں تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی' آپ نے مدرسہ کے شیخ الحدیث کی مسند کو زینت بخشی اور بخاری وترمذی اور ابوداؤد کا درس آپ کو تفویض کیا گیا' آپ اس پر بے حد خوشی کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دونوں استادوں کی جانشینی کا شرف نصیب فرمایا' تقسیمِ ملک تک آپ اسی منصب پر فائز رہے۔

علامہ مشرقی کے خلاف جہاد اور مولانا کی گرفتاری

مصر سے واپسی کے بعد ایک دفعہ اپنے وطن پشاور تشریف لائے' اس زمانے میں عنایت اللہ مشرقی کا فتنہ زوروں پر تھا اور علماء کرام کے خلاف عنایت اللہ مشرقی کے ''مولوی کا غلط مذہب'' نامی پمفلٹ کے کئی نمبر نکل چکے تھے' خاکسار دعویٰ کیا کرتے تھے کہ عنایت اللہ مشرقی کو علمائے ازہر نے ''علامہ'' کا خطاب دیا ہے اور اس کی کتاب ''تذکرہ'' کو علماء سمجھ بھی نہیں سکتے' جب مولانا بنوری مصر سے مشرقی کے کفر کا فتویٰ لائے (جس کا تذکرہ اوپر کی سطور میں آچکا ہے) اور ملک میں اس کی اشاعت ہوئی، تو خاکسار بہت برہم اور سیخ پا ہوگئے' چونکہ پشاور اس فتنے کا مرکز تھا' اس لئے یہاں علماء اور خاکساروں میں سخت چپقلش ہوئی' اسی سلسلے میں جب مولانا تقریر کرنے کے لئے مانسہرہ ضلع ہزارہ تشریف لے گئے تو وہاں انہیں گرفتار کرلیا گیا' ڈاکٹر خان صاحب کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً ٹیلیفون کر کے مولانا کو رہا کرایا اور تھانے دار کو، جس نے مولانا کو گرفتار کیا تھا، تبدیل کر دیا گیا۔

مولانا کی پاکستان میں تشریف آوری

مولانا ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے کہ ملک تقسیم ہوگیا' تقسیم کے بعد مشکل یہ پیش آئی کہ جس خطہ میں پاکستان بنا' وہاں مدرسے نہ تھے اور جہاں دینی درس گاہیں تھیں' وہاں سے مسلمانوں کی اکثریت نے ہجرت کر لی تھی۔ تقسیم سے پہلے یوپی کے مدارس کی بیشتر رونق سرحد، پنجاب اور بنگال کے طلبہ سے تھی' یہی حالت ڈابھیل کی بھی تھی' چونکہ یہ علاقے پاکستان میں آگئے تھے اور پاکستان کے طلبہ کے لئے ہندوستان جانے کی صورتیں ختم ہوچکی تھیں' اس لئے ڈابھیل میں مولانا کے شایانِ شان حلقہ درس نہیں رہا تھا' بہت تھوڑے لوگ وہاں جاتے تھے' چنانچہ پہلے تو مولانا بنوری کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی گئی' مگر چونکہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مولانا بنوریؒ کے مداح اور ان کے کمالات کے قدر شناس تھے' اس لئے مولانا کو پاکستان منتقل کرانے کے مشورے شروع ہوئے' اس وقت پاکستان میں خواجہ ناظم الدین اور شہاب الدین کا دور دورہ تھا' مولانا اتمشام الحق کے ان سے گہرے روابط تھے اور ٹنڈو الہ یار میں ان کا مدرسہ تھا، جسے پاکستان میں ''دوسرا دارالعلوم دیوبند'' بنانے کے

منصوبے تھے اور اس مقصد کے لئے چوٹی کے علماء کو جمع کیا جارہا تھا' اسی سلسلے میں مولانا بنوریؒ کو بھی پاکستان آنے کی دعوت دی گئی اور جب مولانا تشریف لائے تو مولانا احتشام الحق نے کراچی میں موٹروں کے ایک بڑے جلوس کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے مولانا کا استقبال کیا اور مدرسہ ٹنڈوالہ یار میں ''شیخ التفسیر'' کے منصب پر ان کا تقرر ہوا' مولانا بنوریؒ کے ساتھ مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ (سابق صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور و مدرسہ خیر المدارس ملتان) کو بھی بحیثیت شیخ الحدیث اور صدر مدرس کے ٹنڈوالہ یار کے مدرسہ میں لایا گیا۔

اس طرح ٹنڈوالہ یار میں درسِ حدیث شروع ہوا۔ لیکن تھوڑے عرصے میں معلوم ہوا کہ مولانا بنوریؒ کا نباہ مولانا احتشام الحق کے ساتھ نہیں ہوسکتا' مدرسہ کی مجلس شوریٰ میں سیٹھی یوسف صاحب، حاجی سومار صاحب اور حاجی عمر دراز وغیرہ تھے' یہ سب لوگ مولانا بنوریؒ کے ساتھ تھے اور ان کے موقف کو صحیح سمجھتے تھے' طلبہ و مدرسین کو مدرسہ کی انتظامیہ سے (یا زیادہ صحیح الفاظ میں مولانا احتشام الحق) سے شکایات پیدا ہوئیں' حضرت مولانا عبدالرحمٰن مرحوم نے بھی مولانا بنوریؒ کی حمایت کی' بالآخر نزاع نے سنگین صورت اختیار کرلی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ مولانا احتشام الحق کی کھلم کھلا مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے ٹکر ہوگئی اور مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے دھمکی کے جواب میں کہہ دیا: ﴿فاقض ماانت قاض . انما تقضی هذه الحیوة الدنیا﴾

کراچی میں قیام

بالآخر مولانا نے ٹنڈوالہ یار سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنا الگ مدرسہ جاری کرنے کا ارادہ فرمایا' اس موقع پر سیٹھی صاحب نے پچاس ہزار روپے کی پیشکش کی' مگر مولانا نے اسے نامنظور کیا۔ ایک پیر صاحب جن کا اسم گرامی مولانا طفیل یا ماسٹر طفیل تھا اور جن کا کراچی میں پیری مریدی کا سلسلہ تھا' انہوں نے اس وقت بھی کراچی میں ایک دارالتصنیف قائم کر رکھا تھا' موصوف نے مولانا کو ترغیب دی کہ آپ جس طرح چاہیں مدرسہ بنائیں، مالی ضروریات کی کفالت میں کروں گا۔ مولانا نے ان کی رفاقت میں مدرسہ جاری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ''جب ندی'' کے قریب ایک متروکہ ہندو دھرم شالہ مولانا طفیل صاحب کے زیر قبضہ تھا' وہاں پر مولانا بنوریؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس وقت صرف دو جماعتیں تھیں، ایک دورۂ حدیث کی اور ایک درجۂ تکمیل کی۔ مدرسہ میں چونکہ ابتداءً کچھ نہیں تھا' اس لئے مولانا نے تعلیمی و تدریسی رفاقت کے لئے اپنے پرانے دوستوں کو دعوت دی اور لکھا: فی الحال مدرسہ میں تنخواہ کی گنجائش نہیں ہے' توکلاً علی اللہ کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ مولانا کی دعوت پر تین اشخاص نے لبیک کہا۔ ایک تو مردان کے مولانا محمد یوسف تھے جو بنارس میں حدیث پڑھا چکے تھے' دوسرا راقم الحروف تھا اور تیسرے مولانا نافع گل صاحب تھے۔ مولانا یوسف مردانی تو مدرسہ شروع ہونے کے کچھ ہی عرصے

بعد تشریف لے گئے' یہاں بے سروسامانی کا عالم تھا اور..... کچھ عرصے بعد مولانا نافع گل صاحب بھی تشریف لے گئے۔ اور ''حب ندی'' کے کنارے ایک ویرانے میں جسے ''لال جیوا'' کہتے تھے، ہم رہ گئے۔ یہاں ایک عمارت ہے (جس میں آج کل مولانا طفیل صاحب نے کوئی بڑی درس گاہ بنائی ہے) ہماری رہائش تھی۔ تنخواہ کی تو خیر ہم کو ابتداء سے توقع نہ تھی، لیکن سب سے بڑی مشکل طلبہ کے لئے خورد ونوش اور ضروریات زندگی کا سامان مہیا کرنا تھا' یہ ویرانہ کراچی سے خاصی دور تھا' وہاں کا پانی بڑا کڑوا تھا' پینے کا پانی بھی کراچی سے لانا پڑتا تھا' اس عمارت کے گردوپیش غلاظت کے ڈھیر تھے، جہاں مکھیوں کا ہجوم رہتا تھا' ہم لوگ درخت کے نیچے درس دیتے تھے اور اس درخت پر سے ایک قسم کے کیڑے گرتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا مرحوم ایک ہاتھ سے ان کیڑوں کو کتاب بخاری شریف سے ہٹاتے رہتے اور دوسرے ہاتھ سے بخاری شریف کے ورق الٹتے تھے۔ وہ واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا کہ مولانا مرحوم کراچی جا کر طلبہ کے لئے کچھ خوراک کا سامان لائے' مگر وہ بے چارے طلبہ کے بجائے مولانا طفیل صاحب کے نیاز مندوں کے کام آیا۔ الغرض یہاں کا قیام ایسا تکلیف دہ تھا کہ اس کی تصویر کھینچنا ممکن نہیں' یہ زمانہ مولانا کے صبر واستقامت کے امتحان کا تھا' ان دنوں مولانا مرحوم سراپا بے کسی و بے چارگی کا مجسمہ تھے' انہوں نے ان حالات کا بڑی جانکاہی اور پامردی سے مقابلہ کیا۔

نیوٹاؤن میں قیام

مولانا مرحوم عید پر ٹنڈو الہ یار اپنے اہل وعیال کے پاس چلے گئے' آپ کے بال بچے وہاں پر تھے' کراچی میں مکان نہیں ملتا تھا' میں عیدالاضحیٰ کے دن طلبہ کے ساتھ کراچی آیا اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی قبر پر فاتحہ پڑھی' واپسی پر ہم لوگ جمشید روڈ کی اس جامع مسجد میں ٹھہرے' جہاں آج کل شاندار مدرسہ ہے' طلبہ نے عید کے دن نوافل ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا مانگی کہ اے اللہ! ہم بڑے تکلیف دہ مقام میں ہیں' ہم کو اس مسجد میں ٹھکانہ دے دے' بعض وقت استجابت (قبولیت دعا) کا ہوتا ہے' دو چار دن بعد جب مولانا گھر سے واپس آئے تو فیصلہ ہوا کہ یہاں کے بجائے مدرسہ کے لئے کوئی اور جگہ ڈھونڈی جائے' چنانچہ مدرسہ کا سامان جو اب تک خریدا جا چکا تھا وہ مولوی طفیل صاحب کے حوالے کر دیا' صرف چند کتابیں مدرسہ کو دی گئیں اور جامع مسجد نیو ٹاؤن کی انتظامیہ سے مشورہ کر کے مدرسہ اس مسجد کے احاطہ میں منتقل کر دیا گیا۔

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی تاسیس اور مولانا کے صبر واستقامت کا امتحان

اس وقت مدرسہ کے نام کی کوئی عمارت نہیں تھی' مسجد ہی ہماری درس گاہ تھی اور وہی شب کی خواب گاہ بھی' البتہ مسجد کی شمالی جانب ایک حجرہ تھا جس پر ٹین کی چھت تھی' اس میں، میں نے اور مولانا یوسف نے مختصر سا سامان

رکھ دیا، ہم دونوں رات کو سونے کے لئے ایک دوست حاجی یعقوب صاحب دہلی والے کی کوٹھی پر چلے جاتے، صبح چائے بھی ان کے ہاں ہوتی اور دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھاتے، یہاں پیشاب اور قضائے حاجت کی بھی کوئی جگہ نہ تھی، اس طرح ہوٹل کے کھانے اور انسانی ضروریات کے فقدان کی وجہ سے میں سخت بیمار پڑ گیا۔

میں نے مولانا بنوریؒ سے کہا کہ مجھے خراب غذا کی وجہ سے اسہال کی تکلیف ہوگئی ہے، مجھے گھر واپس جانے کی اجازت دے دیں، مولانا نے آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ: اس طرح میں بالکل تنہا رہ جاؤں گا، مجھ کو دو دن کی مہلت دو، میں تمہارا علاج کرتا ہوں، خدانخواستہ تم دو دن میں اچھے نہ ہوئے تو میں ہوائی جہاز سے تمہیں گھر پہنچانے کا انتظام کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں دو دن میں اچھا ہوگیا اور گھر آنے کا ارادہ ترک کردیا، حسب سابق کام شروع کردیا۔

مدرسہ کے لئے ابتداء میں جو انتظامیہ بنائی گئی، اس میں حاجی خلیل صاحب کو مہتمم بنایا گیا (جو سید جمیل صاحب کے والد ماجد تھے، بڑے مخلص اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھے)۔ حاجی یعقوب مرحوم کو خزانچی بنایا گیا، مگر خزانے میں کچھ نہیں تھا۔ صرف طلبہ کے خورد ونوش کے لئے کچھ رقم آجاتی تھی۔

یہاں درس کو جاری ہوئے جب چار مہینے گزر گئے تو میں نے مولانا سے کہا کہ میری گزر بسر کھیتی باڑی پر ہے۔ (مدرسہ میں تنخواہ کے لئے نہ رقم آئی نہ تنخواہ ملی۔ بس فی سبیل اللہ کام چل رہا تھا اور مولانا مرحوم کہیں سے قرض لے لوا کر اپنا اور اہل وعیال کا گزارہ چلاتے تھے) میری فصل کی کٹائی کے دن ہیں، آپ مجھے ایک ماہ کے لئے گھر جانے کی اجازت دیں، تاکہ فصل سمیٹنے کا کچھ بندوبست کرآؤں۔ مولانا مرحوم نے ہنس کر فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مدرسین کے لئے میرے پاس کچھ رقم آئی ہے، ذرا انتظار کرو تاکہ تمہارے کرائے وغیرہ کا تو بندوبست ہوجائے۔ میں نے ہنسی میں کہا کہ: بلی کو چھیچھڑوں کے خواب آیا کرتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد مولانا مسکراتے ہوئے میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''لو مولوی صاحب! چھیچھڑے آگئے ہیں۔'' کسی صاحب نے (غالباً حاجی وجیہ الدین مرحوم نے) مدرسہ کو ۶ سو روپے چندہ بھیج دیا تھا، یہ مدرسہ کے فنڈ میں مدرسہ کا پہلا چندہ تھا۔ اس میں سے مجھ کو بھی دو سو روپیہ دے دیا۔ میں چھٹی پر گھر چلا آیا اور چھٹی گزار کر واپس چلا گیا۔ نیوٹاؤن کے قیام کے زمانہ میں ایک سال بڑی تنگی اور عسرت کا گزرا، تاہم سال کے آخر تک مدرسے کی حالت (مالی طور پر) قدرے اچھی ہوگئی۔

مدرسہ کے بعض شدید اصول

مولانا مرحوم کے تقوے اور خدا ترسی کا یہ حال تھا کہ زکوٰۃ فنڈ صرف طلبہ کے لئے رکھتے تھے، اس کو کبھی کسی حالت میں مدرسین کی تنخواہ یا مدرسہ کی تعمیرات یا کتابوں کی خرید پر صرف نہیں کرتے تھے، دوسرے سال

مدرسہ کی حالت زکوٰۃ فنڈ میں قابل اطمینان ہوگئی۔ ایک دفعہ زکوٰۃ فنڈ میں ۲۵ ہزر روپیہ جمع تھا، مگر غیر زکوٰۃ کی مد خالی تھی، جب تنخواہ دینے کا وقت آیا تو خزانچی حاجی یعقوب صاحب نے کہا کہ مدرسین کی تنخواہ کے لئے کچھ نہیں ہے، اگر آپ اجازت دیں تو زکوٰۃ فنڈ میں سے قرض لے کر مدرسین کی تنخواہ ادا کردی جائے، بعد میں زکوٰۃ فنڈ میں یہ رقم لوٹا دی جائے گی۔ آپ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں! میں مدرسین کی آسائش کی خاطر دوزخ کا ایندھن بننا نہیں چاہتا، مدرسین کو صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہئے کہ ان کے فنڈ میں اللہ تعالیٰ کچھ بھیج دے جو مدرس صبر نہیں کرسکتا، اس کو اختیار ہے کہ مدرسہ چھوڑ کر چلا جائے۔''

جب کوئی ذی ثروت، صاحبِ خیر مدرسہ کو چندہ دینے آتا تو مولانا اس سے فرماتے کہ ''مجھے زکوٰۃ کی ضرورت نہیں، یہ تو غسالہ مال ہے، جسے اگلی امتوں میں آگ آسمان سے اتر کر جلا دیا کرتی تھی۔ میرے مدرسے کے مدرسین کے لئے اگر کچھ دینا ہے تو غیر زکوٰۃ میں سے دے دو۔''

تمام عمر آپ نے چندہ کی کوئی اپیل نہیں کی، نہ مدرسے کا کوئی سفیر تھا، نہ سالانہ جلسہ ہوتا تھا، نہ کبھی کسی بڑے سے بڑے دنیادار سیٹھ کی خوشامد کی، ہمیشہ فرماتے تھے کہ: دنیاوالوں کا علماء سے تعلق کچے دھاگے سے بندھا رہتا ہے، ذرا سی کوئی بات ان کے منشاء کے خلاف ہوئی اور فوراً تعلق ختم ہوا۔

مدرسہ کے دوسرے سال مولانا نافع گل پھر تدریس کے لئے تشریف لائے، آپ کو ان کے ساتھ بڑی محبت تھی، اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

مولانا مرحوم مسجد کے منتظمین کو مدرسہ کے اندرونی معاملات میں دخیل ہونے کا موقعہ نہیں دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ: مدرسہ اور تدریس کے امور کو صرف علماء راسخین ہی سمجھتے ہیں، غیر عالم ان باریکیوں کو نہیں سمجھتا۔

مولانا کے کچھ اوصاف

تصوف اور علم باطن سے مولانا کو بہت شغف تھا اور اولیاء کبار کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ظاہریہ سے خوش نہیں تھے، علمائے دیوبند کے بہت زیادہ معتقد تھے، مگر اس کے باوجود حجاز میں عبداللہ بن باز اور سابق وزیر امور دینیہ کے ساتھ (جو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے تھے) خاصا تعلق تھا۔ شاہ فیصل شہید کے بڑے قدردان تھے۔ شاہ فیصل کے مشیروں نے ان سے آپ کی قابلیت و ذہانت اور خلوص و دیانت کی تعریف کی تھی۔ شاہ فیصل سے مولانا کی جو آخری ملاقات ہوئی، اس میں انہوں نے مولانا سے فرمایا تھا کہ: میں نے بھٹو کو ملاقات کے وقت صاف صاف بتادیا تھا کہ پاکستان کے تین دشمن ہیں: ۱:... قادیانی، ۲:... کمیونسٹ ۳:... مغربی ممالک۔ مولانا نے بھٹو سے جو ملاقات لاہور میں کی تھی، اس میں آپ نے بھٹو سے فرمایا کہ: کیا تم کو ملک فیصل

نے نہیں بتایا کہ قادیانی، کمیونسٹ اور مغربی بلاک پاکستان کے تین دشمن ہیں اور انہی لوگوں نے سازش کر کے لیاقت علی خان کو مروایا تھا؟ مسٹر بھٹو نے مولانا سے کہا کہ: کیا تم مجھ کو بھی مروانا چاہتے ہو؟ مولانا نے برجستہ فرمایا کہ: ایسی موت کسی کو نصیب ہو تو اس پر ہزاروں زندگیاں قربان، جو شخص شہادت کی موت مرتا ہے وہ مرتا نہیں، بلکہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔

لاہور کی مجلس مذاکرہ

سکندر مرزا کے زمانہ میں پاکستان میں مغرب زدہ لوگوں کا طوطی بولتا تھا، حکومت کے ارباب حل وعقد پر بھی ہمیشہ اسی طبقہ کا اثر رہا، ان لوگوں کو یہ تکلیف تھی کہ حکومت جو بھی تجدد پسندانہ نئی حکمت عملی تجویز کرے، اس کے لئے صرف علماء کا طبقہ سنگِ راہ بن جاتا ہے۔ مولانا نور الحق صاحب سابق ڈین اسلامیہ کالج پشاور نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ ایک دفعہ سابق صدر ایوب خان نے مجھ سے کہا کہ:

''تیونس، مراکش، مصر، شام کسی جگہ بھی علماء حکومت کے خلاف دم نہیں مار سکتے، محکمہ اوقاف نے سب کو باندھ رکھا ہے، ایک پاکستان ایسا ملک ہے کہ حکومت کچھ کرتی ہے تو کراچی سے پشاور تک علماء اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دیتے ہیں اور ملک میں ایک ہلچل پیدا ہو جاتی ہے، تم مصر جاؤ اور وہاں جا کر جائزہ لو کہ حکومتِ مصر نے کس ترکیب سے علماء کو باندھ رکھا ہے، پاکستان میں بھی علماء کو پابند کرنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کرو۔''

بریگیڈیئر گلزار احمد صاحب نے بھی میرے سامنے اسی قسم کے خیالات صدر ایوب سے نقل کئے تھے۔

چنانچہ ڈین صاحب مصر گئے اور واپسی پر صدر ایوب کے سامنے تمام مساجد اور مدارس عربیہ کو حکومت کی تحویل میں لینے کا نسخہ کیمیاء تجویز کیا۔ صدر ایوب نے جب اس منصوبے پر عملدرآمد کے لئے تمام مدارس عربیہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ڈین صاحب نے ان سے کہا کہ مصر اور پاکستان کے حالات مختلف ہیں، ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر ہم مدارس کو حکومت کے قبضے میں لے لیں تو مولانا محمد یوسف بنوری جیسے علماء مدارس کے بجائے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیں گے، عرب ممالک میں تو عوام کو مدارس کے لئے چندہ دینے کی عادت نہیں، مگر پاکستان میں ایسے علماء ہیں کہ اگر انہوں نے مساجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تو عوام اور مخلصین ان کو بغیر رسید کے چندے دیں گے اور مسجدوں میں پھر سے نئے آزاد مدرسے قائم ہو جائیں گے، حکومت کے سرکاری مدارس میں تو دینی علوم پڑھنے کے لئے کوئی نہیں آئے گا، اس طرح ہمارا یہ منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔

صدر ایوب نے ڈین صاحب کو مدارس کے لئے نیا نصابِ تعلیم بنانے کا حکم دیا۔ ڈین صاحب بڑے طمطراق کے ساتھ کراچی تشریف لائے' حیدرآباد یونیورسٹی کے داؤد پوتا بھی ان کے ہمراہ تھے' ڈین صاحب نے مفتی محمد شفیع مرحوم اور مولانا بنوری مرحوم سے ملاقات کی اور انہیں نصابِ تعلیم میں ترمیم کا مشورہ دیا۔ مولانا بنوریؒ نے ان کی پوری وعظ وتقریر سن کر فرمایا:

''مدارس عربیہ کا نصابِ تعلیم کون بنائے گا؟ حدیث، تفسیر اور فقہ کے نصاب مرتب کرنے میں آپ جیسے سرکاری ملازمین کی کیا حیثیت ہے؟ نصاب علماء راسخین ہی بنا سکتے ہیں اور وہی بنائیں گے۔''

ڈین صاحب بولے۔ وہ علماء راسخین کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا۔ ''یہ کام یوسف بنوری اور مفتی محمد شفیع صاحب کا ہے۔ آپ کون آئے نصاب بنانے والے۔''

اس گفتگو سے یہ لوگ سخت خفیف ہوئے اور اس ''نئے نسخے'' کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ انہی مغربی سامراج کے پروردوں نے لادینی عناصر کے ساتھ مل کر ایک اور اسکیم بنائی، وہ یہ کہ مختلف ممالکِ اسلامیہ سے علماء کو جمع کر کے ایک مجلس مباحثہ (کلوکیم) منعقد کی جائے' ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے علماء تنگ نظری اور قدامت پسندی میں مبتلا ہیں اور مصر وشام وغیرہ کے علماء آزاد خیال اور تجدد پسند ہیں' یہاں کے علماء کا دین سب سے مختلف ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں وہ بینک کے سود کو حرام سمجھتے ہیں' خواتین کی حیاء وعصمت کی حفاظت کے لئے پردوں کے حامی ہیں اور داڑھی نہیں منڈاتے' بلکہ اسے اسلام کا شعار، مردانہ چہرے کی زینت اور سنت نبوی ﷺ سمجھتے ہیں۔ پرویز وغیرہ ملاحدہ نے حکومت کو یقین دلایا تھا کہ اس مجلس مباحثہ سے قدامت پسند طبقہ کو شکست ہوگی اور مصر وشام کے علماء یہاں کے مولویوں کو تجدد پسندی کا درس دیں گے۔

چنانچہ مصر سے شیخ مصطفیٰ زرقا، معروف دوالیبی، ابوزہرہ (جو اسکندریہ لائے کالج کے پرنسپل اور حیاتِ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، حیات مالک رحمۃ اللہ علیہ، حیات شافعی رحمۃ اللہ علیہ، حیات ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، حیات ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے مصنف تھے اور اصولِ فقہ کے بہت بڑے عالم اور رومن قانون کے بھی ماہر تھے) ایک فصیح وبلیغ مصری عالم مہدی علام اور ازہر کے کئی اور جید علماء کو بھی دعوت دی گئی۔ پاکستان سے مولانا بنوری، مفتی محمد شفیع اور مسٹر غلام احمد پرویز کو مدعو کیا گیا۔[1] مصر وشام کے مندوبین کراچی اترے اور مولانا بنوریؒ کے مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن میں تشریف لائے۔ مولانا کی عبقری شخصیت سے پہلے ہی متعارف تھے' مگر یہاں آکر مولانا کے علم سے بہت ہی متاثر ہوئے۔ مولانا نے ان کے سامنے اس مجلس مباحثہ کے اغراض ومقاصد کو بے

(۱) جہاں تک یاد پڑتا ہے ہندوستان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی اور عبدالماجد دریا آبادی مدیر ''صدق جدید'' کو بلایا گیا تھا۔ (مدیر)

نقاب کیا اور ان تمام مسائل میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ یہ حضرات کراچی سے لاہور پہنچے تو مولانا کے خیالات کی تائید کی۔ ازہر کے علماء نے واشگاف کہا کہ: اسلام میں سود کی کوئی گنجائش نہیں۔ پرویز وغیرہ کو اسلام میں رخنہ اندازی کی جرأت نہ ہوئی۔ حکومت پاکستان کو بھی معلوم ہوگیا کہ ان مسائل میں دنیا بھر کے علماء کے خیالات و معتقدات یکساں ہیں۔ اس کلو کیم سے دینِ اسلام اور علمائے دین کو فائدہ پہنچا' ملاحدہ کی لادینی اسکیم ناکام ہوگئی اور وہ خائب وخاسر ہوکر رہ گئے۔

تحریک ختم نبوت ۵۳ء اور مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا (بنوری) لیاقت علی خان کے زمانے سے ایوب خان کے دور تک سیاسیات سے کنارہ کش رہے اور گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور اصلاح وارشاد کے کام میں مشغول رہے' لیکن جب کبھی کوئی دینی تقاضا سامنے آیا' مولانا بنوری خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑے۔ قادیانیوں کے خلاف پہلی تحریک ۱۹۵۳ء میں برپا ہوئی جو سر ظفر اللہ خان قادیانی کی وزارت خارجہ کے ساتھ خواجہ نظام الدین کی وزارت عظمیٰ کو بھی بہا کر لے گئی۔ اس وقت مولانا بنوری ٹنڈو الہ یار کے مدرسے میں شیخ التفسیر تھے' آپ نے اس وقت بھی تحریکِ ختم نبوت میں عملی حصہ لیا اور ایک جلوس کی قیادت کی جو ظفر اللہ خان قادیانی کی برطرفی کا مطالبہ کررہا تھا' افسوس کہ اس وقت کراچی کے بعض مشاہیر علماء نے تحریک کی مخالفت کی اور خدا کی خوشنودی کے بجائے خواجہ ناظم الدین کی خوشنودی کو ضروری سمجھا' لیکن مولانا بنوری نے اس موقعہ پر کلمہ حق کہنے میں کوتاہی نہیں کی۔

قائد تحریک ختم نبوت

اس کے کئی سال بعد جب بھٹو کے دور میں قادیانیوں کے خلاف دوبارہ تحریک شروع ہوئی تو اس وقت مولانا محمد انور شاہؒ کے جانشین کو اللہ تعالیٰ نے تحریک کی قیادت کے لئے چنا' حضرت مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ قادیانی تحریک سے بڑے فکرمند تھے' ان کی زندگی میں انگریز اقتدار کی بدولت قادیانیوں نے کشمیر میں جو رسوخ حاصل کرلیا تھا' اس پر بہت پریشان تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ:

''مجھ کو قادیانی تحریک سے بڑا خطرہ تھا' اس کی وجہ سے میری رات کی نیند اڑ گئی تھی' لیکن نہ تو ظاہری اسباب و وسائل کے اعتبار سے دنیاوی طور پر مقابلے کی طاقت تھی اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میری اتنی وجاہت تھی کہ میری دعا قبول ہو۔''

یہ حضرت کی شانِ عبدیت تھی جو حق تعالیٰ کی شانِ بے نیازی پر نظر کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کو جو وجاہت حاصل تھی' وہ ان کے کمالات وخدمات سے ظاہر ہے' چنانچہ خود ہی اسی موقع پر

فرمایا کہ: ''بالآخر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ انشاء اللہ! یہ فتنہ بھی اپنے پیشرو فتنوں کی طرح فرو ہو جائے گا اور دینِ اسلام اس رخنہ سے محفوظ رہے گا' اس کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا اور سکون وقرار نصیب ہوا۔''

بہر حال اللہ تعالیٰ نے شیخ انور کی دعا قبول فرمائی اور ان کے علوم وانفاس کے وارث اور جانشین مولانا سید محمد یوسف کو اس جہاد کے لئے تیار کیا۔ باقی جو کچھ تحریک کے دوران گزرا اور مولانا بنوری نے اس کے لئے جو کچھ کیا' اس کے دیکھنے والے لاکھوں انسان زندہ ہیں' اس لئے میں اس سلسلے میں کچھ زیادہ نہیں لکھنا چاہتا' مختصراً یہ اللہ تعالیٰ نے بھٹو جیسے بے دین آدمی کے ہاتھ سے (جس کے انتخاب کے لئے قادیانیوں نے لاکھوں روپیہ خرچ کیا تھا) قادیانیوں کو اسمبلی کی منظوری سے آئینی طور پر خارج از اسلام قرار دلوایا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد بالکل سچ ہے: ''ان اللّٰہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر''.

ترجمہ:... ''اللہ تعالیٰ کبھی اس دین کی مدد کا کام فاجر وبدکار آدمی سے بھی لے لیتے ہیں''۔

مولانا کے علم جہاد کے نیچے تمام دینی وسیاسی جماعتوں نے جمع ہو کر اس تحریک میں حصہ لیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے راہنما

تحریکِ ختم نبوت کی کامیابی کے بعد مسلمانانِ پاکستان کو خیال ہو گیا تھا کہ مولانا کی سی مخلص و بے لوث ہستی اگر میدان میں آجائے تو مسلمانانِ پاکستان کا دوسرا مطالبہ یعنی اجرائے شریعت بھی منظور ہو سکتا ہے' مگر چونکہ مولانا سیاسی ہنگاموں اور نام ونمود سے سخت متنفر تھے اس لئے قادیانیت کو غیر مسلموں کے مرگھٹ میں دفن کرنے کے بعد وہ پھر اپنی سابقہ گوشہ نشینی کی طرف لوٹ گئے اور تعلیم وتدریس میں مشغول ہو گئے' لیکن جب پاکستان کے مسلمانوں کی جدوجہد جنرل ضیاالحق کے ہاتھ میں مکمل ہونے لگی تو جنرل موصوف نے پھر اسلامی نظریاتی کونسل کی راہنمائی کے لئے مولانا کو منتخب کیا' بالآخر مولانا کی وفات کا سانحہ بھی اسی مقدس مشن کی جدوجہد میں پیش آیا:

''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را''

فتنۂ پرویزیت کے خلاف جہاد

ان کارناموں کے علاوہ مولانا کا ایک اور کارنامہ بھی یاد آیا اور وہ تھا مسٹر غلام احمد پرویز کے فتنۂ انکارِ حدیث کے خلاف مولانا کا جہاد۔ پاکستان کے لادینی عناصر نے جس طرح مولانا عبیداللہ سندھی کے نام کو غلط استعمال کیا اور ان کی طرف منسوب کر کے بے ہودہ نظریات پھیلانے کی کوشش کی' اسی طرح مسٹر غلام احمد پرویز کو بھی انگیخت کی اور ''الارض لِلّٰہ'' کے نعرے سے ''نظام ربوبیت'' کے نام کی تحریک اٹھائی۔ اگرچہ مسٹر پرویز کی

ساخت و پرداخت دہلی کے سیکریٹریٹ کے زمانے میں نوکر شاہی کے ہاتھوں ہوئی، لیکن پاکستان میں یہ تحریک ''انکار ملکیت زمین'' کے عنوان سے چلائی گئی۔ جو دراصل کمیونزم نظریہ کے مطابق شخصی ملکیت کے انکار کا پہلا زینہ ہے۔ مولانا بنوری نے اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لئے اس تحریک کے داعی پر ضرب لگانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ مولانا نے مسٹر پرویز کے افکار پر مشتمل ایک رسالہ مرتب کرایا جس کو پڑھ کر تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے اس فتنۂ انکار حدیث کو خالص کفر قرار دیا اور پھر علماء کا متفقہ فتویٰ ''پرویز کافر ہے'' کے نام سے اسے شائع کیا۔ اس طرح یہ عظیم فتنہ فرو ہو گیا' جس کی پشت پناہی غلام محمد گورنر جنرل سے صدر ایوب تک ساری حکومتیں کر رہی تھیں اور جس کی لپٹ میں سرکاری ملازمین اور جدید طبقہ کے ناواقف لوگ آئے ہوئے تھے۔

فضل الرحمانی فتنہ کے خلاف جہاد

اسی لادین ٹولے نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو امریکہ سے درآمد کیا' فضل الرحمٰن مولانا کے مدرسے میں آیا اور مولانا سے ملاقاتیں کیں' کاتب الحروف ان دنوں مدرسہ نیوٹاؤن میں تھا' فضل الرحمٰن نے میرے سامنے یہ بہروپ بنایا کہ میں پہلے ملحد تھا، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی کتابوں کے مطالعہ سے مسلمان ہوا ہوں اور میں ''ادارۂ تحقیقات اسلامی'' کے ذریعے کتاب وسنت کے مطابق اسلام کی اشاعت کرنا چاہتا ہوں' ایک بار اس ملحد کے ساتھ ہم دونوں ''ادارۂ تحقیقات اسلامی'' کے دفتر میں بھی گئے اور پھر مجلس مباحثہ میں مولانا بنوری کو بھی شریک کیا' لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ غلام احمد پرویز یا یہ فضل الرحمٰن ملحد سب علماء کو دھوکہ دے کر اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا بنوری نے اس فتنے کے خلاف علماء کو متحد کر کے انہیں سرکاری نوکر شاہی کے اس پروردہ فتنے سے آگاہ کیا' کچھ عرصے بعد فضل الرحمٰن علماء کے متفقہ احتجاج کی وجہ سے ایوب خان کے آخری دور میں پاکستان سے چلتا بنا اور یہی فتنہ ایوب خان کے زوال کا باعث بنا۔

مولانا کے احباب

اب میں مختصراً مولانا کے احباب کی فہرست لکھتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا بنوری شیخ انور شاہ کے شاگردِ رشید، خادمِ خاص اور ان کی علمی وراثت کے حامل تھے' مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور ان کی زیرِ ہدایت مختلف اذکار واوراد کرتے تھے' حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے انہیں اپنا خلیفہ ''مجاز صحبت'' قرار دیا تھا' مولانا شبیر احمد عثمانی کے آپ شاگرد تھے' مگر وہ آپ سے شاگردوں کے بجائے برابر کے دوستوں کا سا سلوک کرتے تھے اور قدر ومنزلت سے پیش آتے تھے۔ مولانا بدر عالم مہاجر مدنی آپ کے ساتھ بڑی محبت کرتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کو آپ سے جو تعلق خاطر تھا وہ ان مکاتیب سے ظاہر ہے جو انہوں نے

مولانا کو لکھے۔ دیوبند کے مفتی اعظم مولانا مہدی حسن کے ساتھ سورت کے زمانے میں تعلقات تھے' مولانا مہدی حسن دیوبند تشریف لائے تو تعلقات اور بڑھ گئے' افغانستان کے مشہور پیر طریقت، زینت المشائخ، مشہور بہ ''پیر شور بازار'' بھی آپ کے ساتھ محبت کرتے تھے' مصر میں افغانستان کے سفیر صادق مجددی کے آپ کے ساتھ گہرے تعلقات تھے' افغانستان کے ایک بزرگ شیر آغا، جو افغانستان سے آکر ''نوساری'' میں مقیم تھے اور بیس سال تک مدینہ شریف میں مقیم رہے، ان کی بھی آپ پر بڑی شفقت تھی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے ساتھ جو تعلق تھا وہ ایک خط سے ظاہر ہے جو مفتی صاحب کی وفات پر انہوں نے مجھے لکھا تھا۔ وطن میں سب سے زیادہ تعلق مولانا عبدالحق نافع کا کاخیل سے تھا اور آخری دور میں تو پاکستان کے تمام مشاہیر کے ساتھ روابط اور تعلقات زیادہ ہو گئے تھے' نہ صرف ان کی شرافت ونجابت اور خوش خلقی کی وجہ سے' بلکہ ان کی بزرگی اور علمی بلندی کی وجہ سے پاکستان میں تمام اکابر اور علماء کے ساتھ تعلقات تھے۔ تحریک ختم نبوت کے زمانے میں مظفر علی شمسی کے مداح اور نواب نصر اللہ خان کی سیاسی سوجھ بوجھ کے معترف تھے' شام کے ایک حنفی عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، جو شیخ محمد زاہد الکوثری کے شاگرد رشید، ان کے علوم کے حامل، دورِ حاضر میں مذہب حنفی کے بہت بڑے عالم اور کلیۃ الشریعۃ ریاض میں فقہ کے شیخ ہیں، وہ بھی مولانا کے مخلص احباب میں سے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری سے مولانا کو بڑی مودت وموانست تھی' جناب مولانا مفتی محمود کے ساتھ بھی بڑے گہرے تعلقات تھے' مفتی صاحب نے صوبہ سرحد کی وزارت علیا کے زمانے میں مولانا کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں مدعو کیا تھا اور مروجہ قوانین کو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس دعوت میں سرحد کے گورنر اراباب سکندر خلیل، تمام وزراء اور اعیان ومشاہیر نے شرکت کی تھی۔

.....☆.....☆.....☆.....